ڈاکٹر سید ظفر عباس

بیسویں صدی میں جدید مرثیہ

(۱)

بیسویں صدی کا ذکر آتے ہی ذہن تاریخ کے اوراق کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ صدی انقلاب انگیز صدی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی اسباب کی بنا پر برِ صغیر پاک و ہند میں شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس صدی نے بڑے بڑے کج کلاہوں کے سروں سے تاجِ سلطنت اُتار لیے تھے۔ اس نے ایک طرف صنعتی زندگی کے ساتھ سیاسی انتشار دیا تو دوسری طرف سرمایہ و محنت کا ایک نیا تصور دیا۔

بیسویں صدی نے انسان اور انسان کے درمیان حائل تنگ نظری اور سماجی نشیب و فراز کو کم کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سائنسی علوم و فنون میں انقلابی ترقی اور صارفی تہذیب نے فکری زاویوں کو تبدیل کر دیا۔ اس معاشرتی شکست و ریخت اور ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں پورا معاشرہ تذبذب، بے یقینی، بے چینی اور انتشار کا شکار ہو چکا تھا جب کہ دوسری طرف عالمی سطح پر سیاسی، سماجی اور علمی ترقی کا دور تھا۔ ہمارے ہاں برِ صغیر پاک و ہند میں سیاسی تحریکوں کا زمانہ تھا۔

بیسویں صدی کا ذکر اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے لیکن ماضی کے رشتوں کو سمجھے بغیر نہ ادب پر بامعنی گفتگو ہو سکتی ہے اور نہ تہذیب و ثقافت پر۔ اس لیے شعر و ادب ہو یا تہذیب و ثقافت، انھیں توانائی ماضی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا صورتِ حال نے دوسرے دوائر کی طرح ادب کے دائرے کو بھی متاثر کیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''سرسید نے تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اپنے تئیں معاشرے کو سدھار لیا جبکہ حالی نے مسدسِ حالی لکھ کر تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح کر کے سرسید سے حق دوستی ادا کر دیا۔''[۱]

یوں سیاسی اور اقتصادی، علمی و تہذیبی سطح پر تبدیل ہوتی ہوئی زندگی نے صدیوں سے چلی آ رہی شعری روایت کی بساط کو اگر مکمل طور پر تبدیل نہیں کیا تو اس پر ایسے سوالیہ نشان لگا دیے جنھوں نے وقت کی رفتار سے بے خبر شعرا اور ادیبوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اگر کوئی اُس دور کے شعر و ادب کا بغور مطالعہ کرے تو معلوم ہوگا کہ اُس پژمردہ اور خراب حالات کی وجہ سے شعر و ادب میں ایک طرف تو مایوسی، اضمحلال اور تھکن کا

لہجہ ظاہر ہوا جب کہ دوسرے رُخ پر اس کے ردِعمل میں ایک تند و تیز، گھمبیر اور دبنگ لہجہ معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ اُس زمانے میں سیاسی اور معاشی صورتِ حال کی وجہ سے شعر و ادب میں بھی ایک زبردست احتجاج اور مزاحمت کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ بیش تر اصنافِ ادب کی طرح مرثیے نے بھی عصری مسائل کو جذب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے بیش تر مسائل اُس زمانے کے مرثیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی میں مرثیے کا نیا سفر برِصغیر کے اس زوال پذیر معاشرے کی دہلیز سے شروع ہوتا ہے جس میں فیوڈل سسٹم کے نئے جال بُنے جا رہے تھے اور انگریزوں کی حاکمیت اس خطے میں اپنے نظامِ فکر کے بیج بو رہی تھی۔'' ۲

یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں قدرتی طور پر شعر و ادب کی دُنیا میں بھی انقلابی سطح پر اثرات مرتب ہوئے۔ نظم و نثر کی جملہ اصناف کی طرح اردو مرثیہ نے بھی اُس انقلاب انگیز ماحول اور فضا کا اثر قبول کیا اور اپنے اندر موضوع و مواد کے حوالے سے تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''اردو کے رثائی ادب میں مرثیہ ادبی شکوہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جسے انیسؔ و دبیرؔ کی فکری جودت نے ایسی منزل پر پہنچا دیا جس میں کسی اضافے یا تبدیلی کی گنجائش کا تصور بھی مشکل تھا لیکن اُس کے رنگ و آہنگ میں بھی تبدیلی نظر آنے لگی۔ بیسویں صدی کے اسی موڑ پر جدید مرثیے کی ابتدا ہوئی۔'' ۳

اردو مرثیے کو انیسؔ و دبیرؔ نے جس مقامِ اوج پر پہنچا دیا تھا اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا لیکن بیسویں صدی کے شعرا کو جب ہر قدم پر ایک نئی کربلا کا سامنا کرنا پڑا تو حضرت امام حسینؑ اور اُن کے اُسوۂ حسنہ بے اختیار یاد آئے اور کربلا کے واقعے کو مرثیے میں اس طرح پیش کیا جانے لگا کہ یہ جدید زمانے کا ایک اہم استعارہ بن گیا۔ بیسویں صدی کے اسی موڑ پر جدید مرثیے کی ابتدا ہوئی اور شاید مرثیہ اپنی مکمل تہذیب و اصلاح کے لیے بیسویں صدی کا منتظر تھا۔

حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے حوالے سے انیس و دبیر کے علاوہ بھی بہت سے مرثیہ گو سامنے آتے ہیں۔ تاہم ملک کی بدلتی ہوئی سیاسی و اقتصادی صورت میں نئے مرثیہ گو شعرا کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مرثیہ گو شعرا کی روایت کو آگے بڑھاتے تاہم جوش ملیح آبادی، سید آلِ رضا، جمیل مظہری، سید کاظم علی، جعفر علی خان اثر لکھنوی، نجم آفندی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، قیصر بارہوی، سید وحید الحسن ہاشمی، شاہد نقوی، نسیم امروہوی، صبا اکبر آبادی، امید فاضلی، ڈاکٹر ہلال نقوی وغیرہ نے جدید مرثیے کے خدوخال سنوارے۔ یاد رہے کہ بیسویں صدی کے عظیم مفکر شاعر ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ نے بھی اپنے کلام میں جا بجا واقعۂ کربلا اور حُسینیت کے

حوالے سے شعر کہے ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اُنھوں نے روایتی انداز میں کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ البتہ اُن کے تخلیق کردہ مجموعۂ کتاب "رموزِ بے خودی" (مطبوعہ:۱۹۱۸ء) میں بعنوانِ "درمعنی حریتِ اسلامیہ وسرِ حادثۂ کربلا" میں جو اشعار لکھے ہیں اُن میں سانحۂ کربلا ایک نئی معنویت لے کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً:

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است ۴

یوں تو غالبؔ جیسے بڑے اُستاد شاعر بھی کہہ چکے ہیں:

فریاد کی کوئی "لے" نہیں ہے!! — "نالہ" پابندِ نے نہیں ہے! ۵

لیکن ایک ایسی صنف جو خالص کلاسیکی اور روایتی اقدار سے وابستہ ہو، اُس میں اتنی بہت بڑی تبدیلی واقعی تعجب خیز اور حیران کُن ضرور ہے کہ وہ اپنے دور کے انقلاب کی آواز بن جائے اور واقعۂ کربلا جبر و استحصال، ظلم و زیادتی، ناانصافی اور غلامی کے خلاف عصری احتجاج کی علامت بن جائے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار — اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دُنیا کے شہریار — پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے — اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؓ دے ۶

جوشؔ کی اسی انقلابی سوچ و فکر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"جوشؔ رثائی ادب کی کلاسیکی روایت سے جو مذہبی مقصد کے لیے مخصوص تھی، سیاسی نوعیت کا کام لے رہے تھے۔ اس پر کچھ اعتراض بھی ہوئے۔ بہ ایں ہمہ اس کا اعتراف بھی کیا گیا کہ جوشؔ نے مرثیے میں انقلاب اور قومی آزادی کے تصور کو رواج دیا۔" ۷

مذکورہ بالا شعرا میں جوش ملیح آبادی کا نام اس لیے بے حد اہم ہے کیوں کہ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ مطبوعہ شکل میں ان کا پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" سے اردو ادب میں جدید مرثیے کا آغاز ہوتا ہے، جس میں امامِ عالی مقام کے کارناموں کو اس کی بھرپور اخلاقی معنویت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً:

شعلے کو سیاہی سے ملایا نہیں تُو نے — سر کفر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں تُو نے
وہ کون سا غم تھا جو اُٹھایا نہیں تُو نے — بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا نہیں تُو نے
دامانِ وفا، گھر کے شریروں میں نہ چھوڑا — جو راستہ سیدھا تھا، وہ تیروں میں نہ چھوڑا ۸

اسی طرح امام حسینؓ کے بلند حوصلے اور صبر و استقلال کی سچی تصویریں پیش کرتے ہوئے بیانِ

شہادت کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں:

کرتا ہوں رقم معرکہ اب کرب و بلا کا　　طوفان تھا، سیلاب تھا، اربابِ جفا کا
سینوں میں تلاطم تھا وہ ساماں تھا دغا کا　　بشاش، مگر دل تھا امامؑ دو سرا کا
ماتھے پہ شکن تھی نہ بدن غرقِ عرق تھا　　رُخ پر وہ صباحت تھی کہ سونے کا ورق تھا [9]

ان کے مجموعۂ کلام ''شعلہ و شبنم'' (مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) میں ان کی نظمیں ''ذاکر سے خطاب''، ''آنسو اور تلوار''، ''سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب''، ''اے مومنانِ لکھنؤ''، یہ تمام مرثیے صنفِ مرثیہ ہونے کے باوجود روایتی مرثیے سے بالکل منفرد ہیں۔ ان مرثیوں میں شہادت کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اسے عصری زندگی کے مختلف مسائل سے ہم آہنگ کیا گیا ہے جس میں اُن کی فکری تغیر کی آہٹ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر جوشؔ نے ۱۹۴۱ء میں ۶۸ بندوں پر مشتمل معرکہ آراء مرثیہ ''حسینؑ اور انقلاب'' لکھا۔ یہاں اس مرثیے میں جوشؔ ایک قدم اور آگے نظر آتے ہیں جس میں جوشؔ حضرت امام حسینؑ کی ذات کے حوالے سے حیات و کائنات کی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے ہیں۔ اس مرثیے میں اُنھوں نے جذبۂ آزادی اور حریتِ فکر جیسے انقلابی سوچ و فکر کو حسینیؑ فلسفے سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو　　یہ جو مچل رہی ہے صبا، پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرا رہی ہے لو　　در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو　　یہ بھی اُسی جری کی ہے آواز دوستو
پھر حق ہے آفتاب لبِ بام اے حسینؑ!　　پھر بزم آب و گل میں ہے کہرام اے حسینؑ!
پھر زندگی ہے سُست و سبک گام اے حسینؑ!　　پھر حریت ہے موردِ الزام اے حسینؑ!
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے　　پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے [10]

اس ضمن میں جوشؔ کی بعض اور نظموں جیسے ''موحد و مفکر''، ''وحدتِ انسانی''، ''عظمتِ انسانی''، ''آگ'' اور ''موت آلِ محمدؐ کی نظر میں'' وغیرہ کا بھی نام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ تمام مرثیے جوش اور جذبے کے لحاظ سے ''حسینؑ اور انقلاب'' تک نہیں پہنچ پاتیں۔

ہم یہ بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں جوشؔ نے مرثیے کو تجدد آشنا کیا۔ جوشؔ کی صدائے انقلاب کربلا، قربانی اور ایثار کی علامت کا پتا دیتی ہے۔ انھوں نے مرثیے سے تنقیدِ حیات کا کام لیا اور ''آوازۂ حق''، ''حسین اور انقلاب'' اور ''قلم'' میں زمانہ حال کی جدلیاتی کیفیت آشکار کی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ نے امام حسینؑ اور اُن کے اصحابؓ کے حوالے سے قربانی اور اُس کے فلسفے اور حسینیؑ کرداروں کی انقلابی

سوچ وفکر کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جوشؔ کے اس انقلابی سوچ اور جدت طرازی کے سلسلے میں عباس حسینؒ کاظمی لکھتے ہیں:

''جوشؔ کو اکثر لغت کے سہارے پڑھنے کی کوشش کی گئی۔ جوشؔ لغوی و معنوی الفاظ میں محدود نہیں ہیں۔ وہ الفاظ سے پیکر اور پیکر سے نئے نئے تلازمات اور تلازمات سے معنی کی قوسِ قزح تخلیق کرتے ہیں۔''[11]

جوشؔ نے اپنے مرثیوں کو ایک وسیع کینوس مہیا کر کے حسینیؑ کرداروں کو محدود و مخصوص مسلک و مذہب کے دائرے سے نکال کر پورے عالمِ انسانیت کے لیے ایک عملی نمونے کے طور پر پیش کیا۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ [12]

جوشؔ ملیح آبادی کے بعد جدید اردو مرثیے میں ایک اور بڑا نام سید آلِ رضاؔ کا ہے جنھوں نے مرثیے کے بنانے سنوارنے میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ ویسے تو سید آلِ رضا نے کئی شان دار مرثیے تحریر کیے ہیں لیکن ۱۹۳۹ء میں ''کلمۂ حق کی تحریر دل فطرت میں'' اور پھر اس کے تین برس بعد ''شہادت کے بعد'' لکھا۔ یہ دونوں موصوف کے جدید مرثیوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اُن کو اصل شہرت ان کے ۱۵۶ بند پر مشتمل مرثیہ ''عظمتِ انسان'' (مطبوعہ: ۱۹۶۷ء۔۔۔لاہور) کی وجہ سے ہوئی جسے اردو ادب کے بے شمار نقادوں نے متفقہ طور پر نئے انداز اور جدید طرز کا حامل مرثیہ تسلیم کیا ہے۔ یہاں سے مرثیہ نگاری کے پاکستانی دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں ہر مسلک اور نظریے اور ہر مکتبۂ فکر اور ہر عقیدے سے تعلق رہنے والے جدید شعرا شامل ہیں۔ اب مرثیہ روایتی انداز تک محدود نہیں رہا یعنی مسدس کی بجائے آزاد اور نثری نظم تک کے پیرائے میں بھی مرثیے لکھے جانے لگے۔ آج کل مرثیہ روایتی آہ و بکا کے انداز سے ہٹ کر حضرت امام حسینؑ کو ظلم و ستم کے مقابل آ کر حق کا بول بالا کرنے میں بطورِ علامت پیش کرنے کا رجحان بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول قیصر بارہوی:

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے [13]

سید آلِ رضاؔ نے اپنے مرثیوں سے شعورِ انسانیت بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کے لیے شہیدِ کربلا امام حسینؑ کو مثالی انسان کی علامت بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے اسلام کی تاریخ اور تعلیم میں کردارِ بی بی زینبؑ و امام حسینؑ کو اس طرح مؤثر انداز میں پیش کیا کہ قربانی و ایثار کی مثال سامنے آ جاتی ہے۔ چنانچہ آلِ رضاؔ کا مرثیہ بیک وقت سوانح بھی ہے اور فکر و عمل کی تاریخ بھی۔ ڈاکٹر مسیح الزماں، آلِ رضا کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آلِ رضا کا مقصد بیانِ شہادت نہیں تھا بلکہ مقصدِ شہادت کا بیان تھا۔''[۱۴]

آلِ رضا نے اپنے مرثیوں میں دینِ اسلام سے متعلق زرّیں اصولوں کو بیان کیا ہے کہ اصل میں ان اُصولوں کا مقصد ومنشا اول وآخر حضرتِ انسان کی عظمت و بڑائی میں اضافہ کرنا ہے۔ ذیل میں اُن کے مشہور مرثیے ''عظمتِ انسان'' میں سے اول وآخر بند پیش کیا جاتا ہے:

اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو — اسلام کہنہ نفس کا عرفاں ہے دوستو
اسلام نظم غیب پہ ایماں ہے دوستو — اسلام صرفِ حکمتِ قرآں ہے دوستو
قرآن سے جو نسبتِ عقلِ سلیم ہے — کہنا پڑے گا خلقتِ انساں عظیم ہے
انساں کا یہ مرقع عظمت ہے یادگار — سجدے پہ افتخار، شہادت پہ اعتبار
دوہرے شرف میں ایک سے ہے ایک ذی وقار — دل پر وہ اختیار کہ عالم پہ اختیار
دونوں پہ ایک ساتھ حکومت حسینؑ کی — سجدہ حسینؑ کا ہے، شہادت حسینؑ کی [۱۵]

بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے جدید مرثیہ نگاروں میں ایک اور بڑا نام نسیم امروہوی کا ہے۔ آپ ۲۴ اگست ۱۹۰۸ء کو امروہہ ضلع مراد آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید قائم رضا اور تخلص قائم تھا۔ ابتداء میں اپنے تخلص کی نسبت سے قائم امروہوی کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن بعد میں نواب سید باقر علی شاہ کی فرمائش پر اپنا تخلص تبدیل کر کے "نسیم" رکھ لیا اور "نسیم امروہوی" کے نام سے زبان زدِ عوام وخاص ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب نویں امام حضرت امام محمد تقیؑ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا خاندان علم و ادب کے حوالے سے امروہہ میں مستند سمجھا جاتا تھا۔

نسیم امروہوی کو ورثے میں شعری ذوق ملا۔ آپ کے ہاں باقاعدہ چار نسلوں سے متواتر شاعری کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ آپ کے ننھیال اور ددھیال دونوں خاندانوں میں یگانۂ روزگار علمی و ادبی شخصیات پیدا ہوئیں۔ نسیم امروہوی کے جدِ امجد خادم حسین ایک صاحبِ طرز اور بلند پایہ مرثیہ نگار تھے۔ اُس کے بعد اُن کے بیٹے حیدر حسین یکتا بھی ایک مایہ ناز مرثیہ نگار تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر حیدر حسین یکتا کے بیٹے جواد حسین شمیم کے رگ رگ میں صنفِ مرثیہ سما گئی۔ شمیم امروہوی ایک صاحبِ طرز ادیب، شاعر اور بلند پایہ مرثیہ نگار تھے جنھیں اپنی شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر ''فرزدقِ ہند'' کا خطاب بھی ملا۔

ان کے بعد موصوف کے صاحب زادے اور جناب نسیم امروہوی کے والد برجیس حسین برجیس ایک سچے و پکے مسلمان اور بے مثال مرثیہ گو تھے جن کے مرثیے آج بھی مجالسِ عزا میں حاضرینِ مجلس سے داد وصول کرتے ہیں۔ نسیم امروہوی نے بارہ برس کی عمر میں اپنے دادا شمیم امروہوی کے زیرِ تربیت شاعری کا آغاز

کیا۔آپ نے ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ لکھا۔نسیم امروہوی کے کُل مرثیوں کی تعداد ۱۶۲ بتائی جاتی ہے۔شروع شروع میں اپنی والدہ کی فرمائش پر دو شعر لکھے اور اپنے دادا سے جزوی اصلاح لے کر باقاعدہ طور پر شعرا کے حلقے میں داخل ہو گئے۔نسیم نے اپنے مرثیوں میں ہر بیان کو مدلل طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے لیے اُنھوں نے دلیل کے طور پر قرآنِ پاک کے آیات کے بعض ٹکڑے تک اپنے اشعار میں شامل کیے ہیں جب کہ بعض مرثیوں میں تو مکمل سورتوں کی تفسیر منظوم انداز میں پیش کی گئی ہے۔ذیل میں نسیم امروہوی کے اصلاح شدہ وہ دو اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہمارے محمدؐ تمہارے محمدؐ سبھی اُمتی کے سہارے محمدؐ
سحر اُٹھ کے ہم جن کا پڑھتے ہیں کلمہ وہ ہیں آمنہؓ کے دُلارے محمدؐ [۱۶]

کچھ عرصہ امروہہ میں قیام کے بعد نسیم امروہوی میرٹھ چلے گئے لیکن بہت جلد وہاں سے پھر لکھنؤ آ کر سکونت اختیار کی۔لکھنؤ کے شعری و ادبی ماحول نے اُن کی شاعری پر مثبت اثرات مرتب کیے۔اُنھوں نے لکھنوی علما اور شعرا سے خوب استفادہ اُٹھا کر اپنے مخصوص اندازِ سخن سے بہت بڑا نام کمایا۔وہ خود اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

''لکھنؤ کے قیام میں مجھے شعر و سخن کا ماحول بھی ملا اور اساتذۂ فن اور علماء کی صحبتیں بھی نصیب ہوئیں ۔۔۔غرضیکہ دن رات کی ان صحبتوں اور شاعرانہ ماحول کا میری مرثیہ گوئی پر بہت اچھا اثر پڑا۔میں نے خود بھی بہت جلد محسوس کیا کہ اب میرے اندازِ فکر اور حسنِ بندش میں روز بروز ایک خوشگوار تبدیلی آتی جا رہی ہے۔۔۔'' [۱۷]

آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسیم امروہوی نے اردو مرثیے کو ہیئت اور مواد دونوں لحاظ سے جدید عہد کے تقاضوں کے عین مطابق بہرہ ور کیا۔اُنھوں نے اپنے مرثیوں میں جدید شعری رُجحانات و میلانات اور عصری آشوب کو پیش کیا۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے مرثیوں میں آج بھی ہمیں جدید اسلوب اور سوچ و فکر کے لازوال پوشیدہ خزانے ملتے ہیں۔اردو مرثیے کو انیس و دبیر نے جو مقام و مرتبہ بخشا تھا، بعد میں نئے آنے والے مرثیہ نگاروں کے لیے اُس میں نئی جدتیں پیدا کرنا تھوڑا سا مشکل تھا۔لیکن نسیم امروہوی وہ مردِ مجاہد ہیں جنھوں نے انیس و دبیر کی روایت کو بھی زندہ رکھا اور اپنے لیے بھی ایک ایسا راستہ طے کیا کہ جس پر چل کر وہ بہت زیادہ کامیاب و کامران ہوئے۔اس سلسلے میں پروفیسر عارف عبدالمتین کہتے ہیں:

''سوادِ مرثیہ میں اُنھوں نے اردو کی اُس عظیم صنفِ سخن کی عظیم روایت کے دل پذیر تسلسل کا یوں اہتمام کیا کہ عہدِ نو کے تہذیبی و ثقافتی تقاضوں کا درخشاں پہلو بھی نظر انداز نہ ہونے پایا۔۔۔'' [۱۸]

اس سلسلے میں سید عاشور کاظمی کے رائے سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی:

''اُنھوں نے قدیم لہجے اور اسلوب میں جدید فکر سمونے کی کوشش کی جسے مدھم آنچ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو حرارت تو باقی رکھتی ہے لیکن اُس سے آگے کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔۔۔ یہی نہیں کہ وہ ہمارے عہد میں مرثیے کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد میں اور اس تناظر میں ان کا کوئی مدِ مقابل بھی نہیں ہے۔''[19]

نسیم امروہوی ۱۵ مئی ۱۹۵۰ء کو لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی (پاکستان) میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں کی علمی و ادبی فضا کو آپ نے اپنے شعری نظریات و افکار سے مالا مال کیا اور گہرے نقوش چھوڑے۔ عمر کے آخری حصے میں آپ سندھ کے علاقے میر پور خاص میں گوشہ نشین ہوئے اور ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے جدید اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک اور اہم نام جمیل مظہری کا ہے جن کی آواز جوشؔ یا دوسرے جدید مرثیہ نگاروں سے کچھ خاص مختلف نہیں ہے۔ جمیل مظہری نے سب سے پہلا مرثیہ ۱۹۳۰ء میں "عرفانِ عشق" کے عنوان سے لکھا۔ یہاں اس مرثیے سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

نبضِ جاں تیز رہے، مقصدِ فطرت ہے یہی — دل دھڑکتے رہیں سینوں میں محبت ہے یہی
آدمی غم سے نہ گھبرائے، شجاعت ہے یہی — دل پہ قابو رہے، شرطِ بشریت ہے یہی
نشہ ہو بے خودیٔ شوق میں ہشیاری کا — زندگی نام ہے جذبات کی بیداری کا[20]

اُنھوں نے جس دور میں مرثیے لکھے یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب پر ہر طرف ترقی پسند سوچ، فکر اور رجحانات پَر پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی دور میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ان ادیبوں نے انسانی بیداری کے لیے ادب کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اسی رُجحان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جمیل مظہری نے پیغامِ حسینیؑ کو فکر و ضمیر کی آزادی کا پیغام قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے مرثیے کے روایتی مقصد رونے رُلانے کے برعکس اپنے مرثیوں میں قومی بیداری کو اولیت دی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

گونجتی ہے دل احرار میں تیری تکبیر — تیرا پیغام ہے کیا حُریت فکر و ضمیر
تُو نے انساں کو سکھایا یہ سبق عالم گیر — غیر اللہ کو سجدہ ہے خودی کی تحقیر
شرک اک شکل اسی جذبۂ گمراہ کی ہے — بادشاہوں کی یہ دُنیا نہیں اللہ کی ہے[21]

آپ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں اس فانی دُنیا سے کوچ کر گئے۔

جدید اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک اور معتبر نام تجمّل آفندی کا ہے۔ آپ کا پورا نام مرزا تجمّل حسین تھا۔ تجمّل یا تجمّی تخلص فرماتے تھے۔ گھر والے ان کو نادر مرزا کے نام سے پکارتے تھے لیکن اُن کو شہرت تجمّل آفندی کے نام سے ملی۔ وہ ۱۸۹۳ء میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کو اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز بحیثیتِ غزل گو کیا۔ شروع شروع میں اپنے والد بزم آفندی (جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے) سے اصلاح لیتے تھے مگر جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔ آپ کو "شاعرِ اہلِ بیتؑ" کے خطاب سے نوازا گیا۔ تقریباً ۷۰ برس آپ شعر و شاعری سے وابستہ رہے۔ وطن دوستی، انگریز نفرت اور قومی محبت اُن کے ریشے ریشے میں گُوٹ گُوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن افسوس صد افسوس کہ برِ صغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے ادیبوں، نقادوں، محققین، تجزیہ نگاروں، میڈیا (پرنٹ اور الیکٹرانک)، مبصرین اور حکومتوں نے اُن کو اور اُن کے کلام کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ حق دار تھے۔ اُن کو آزادی کے بعد جو خراج پیش کیا گیا وہ اصل میں اُن کی زندگی میں ملنا چاہیے تھا۔ بقول شاعر:

منزل اُنھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

تجمّل آفندی نے مرثیے کم لکھے ہیں جب کہ سلام، نوحے اور رُباعیات زیادہ لکھیں ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں کافی عرصے تک کوئی ایسی امام بارگاہ نہیں تھی، جہاں ان کے نوحے، سلام اور رباعیاں نہ پڑھے جاتے رہے ہوں۔ اُنھوں نے سب سے پہلا مرثیہ "فتحِ مبین" کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں تصنیف کیا۔ وہ اپنے مرثیوں کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اپنے قارئین میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے مرثیوں میں فلسفیانہ رنگ غالب نظر آتا ہے اور یہی خصوصیت اردو مرثیہ نگاری میں اُن کے لیے باعثِ انفرادیت ٹھہرا۔ اُن کے نزدیک امام حسینؑ حق و صداقت کے راستے پر جان دینے والے صرف ایک شہید نہیں بلکہ اُن کی شخصیت اور کردار میں اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں جس کی طرف شاعر ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

انسانیت کو جس نے سنوارا ہے وہ حسینؑ — جو حسنِ معنوی کا سہارا ہے وہ حسینؑ
جس نے دلوں میں درد اُبھارا ہے وہ حسینؑ — روحِ بشر کو جس نے پکارا ہے وہ حسینؑ
آواز جس کی دُور کے انسان تک گئی — بجلی سی سامعہ کی فضا میں چمک گئی [۲۲]

تجمّل آفندی حسینیؑ آواز یا حسینیؑ فلسفے اور نظریے کی دور کے انسان تک رسائی کے قائل تو ہیں ہی لیکن وہ زمین و آسمان اور چاند پر انسان کی امکانی بستیوں میں حضرت عباس علمدارؑ کا علم لہرانے کی خواہش اپنے دل میں بسائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم، ہر بشر مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسؑ نام ور کا علم لے کے جائیں گے ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے [۲۳]

عصرِ جدید میں غزل گوئی کے میدان کے شہسوار صبا اکبر آبادی ہیں۔ آپ ۱۹۰۸ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ بنیادی طور پر صبا اکبر آبادی غزل گو شاعر تھے لیکن زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے مرثیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ انھوں نے اُناسی (۷۹) مرثیے تخلیق کیے۔ صبا اکبر آبادی وہ باوصف مرثیہ گو شاعر ہیں جن کے ہاں قدیم مرثیے کی روایت بھی زندہ ہے اور جدید مرثیہ نگاری کے حوالے سے بھی نمائندہ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ صبا اکبر آبادی کی مرثیہ گوئی کے بارے میں معروف محقق مشفق خواجہ جوشؔ ملیح آبادی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک قدرتِ کلام اور شاعرانہ محاسن کا تعلق ہے، صبا صاحب کی مرثیہ نگاری دراصل قدیم فنِ مرثیہ ہی کی توسیع ہے'' اس لیے تو جوشؔ ملیح آبادی نے کہا تھا:

"اُن کے مرثیے سُن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میر انیسؔ کی روح بول رہی ہے۔'' [۲۴]

صبا اکبر آبادی کے مرثیوں کے مجموعے ''سر بکف''، ''شہادت'' اور ''خوناب'' کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی بہتر (۷۲) سالہ شعری زندگی میں اعلیٰ پایہ کے مرثیے تخلیق کیے ہیں۔ اُن کا انتقال ۱۹۹۱ء کو کراچی میں ہوا۔

جدید مرثیے کی تاریخ میں ایک اور اہم نام ڈاکٹر سید صفدر حسین کا ہے۔ اُنھوں نے خود بھی جدید مرثیے تخلیق کیے اور جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ و تنقید کے حوالے سے بھی انتہائی اہم کام سرانجام دیا۔ اُن کے مرثیوں پر مشتمل مجموعہ ''لبِ فرات'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے دیگر نمایاں تنقیدی و تاریخی کُتب میں ''کاروانِ مرثیہ''، ''منزل بہ منزل'' اور ''شاہکارِ انیس'' شامل ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا۔

بیسویں صدی کے آخر میں جس شاعر نے اردو مرثیے میں اجتہادی اور فکر انگیز تبدیلیاں کیں اُسے مقبولِ خاص و عام بنا دیا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ قیصر بارہوی ہیں۔ قیصر بارہوی مختلف النوع اصنافِ سخن پر مکمل دسترس رکھنے والے شاعر ہیں۔ اُنھوں نے اردو شاعری کی تقریباً تمام مروجہ اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنی جدتِ طبع کے رنگا رنگ جوہر دکھائے۔ قیصر بارہوی ۱۹۲۷ء میں کرنال میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۲ء میں دیارِ سخن میں قدم رکھا۔ ابتدا میں آپ غزل گوئی کی طرف مائل رہے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ سلام، قصائد اور منقبت جیسے اصناف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس گلستان میں رنگا رنگ پھول

کھلائے۔اُن کے غزلوں،قصیدوں اور سلاموں کے مطالعے سے اُن کی حساس طبیعت، ذہنی کشادگی اور الفاظ پر مکمل قدرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اُن کے کلام میں جیسے ہی فنی پختگی آئی تو وہ مرثیے کے صنف کی طرف مائل ہوئے۔اُن کے مرثیوں،نوحوں اور سلاموں سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے کلام میں داخلی کیفیات کے اظہار کے ساتھ ساتھ خارجی معاملات کا بیان بھی پایا جاتا ہے۔یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیصر بارہوی کا کلام جذبات واحساسات کا مجموعہ ہے تاہم اُن کے مرثیوں میں داخلی وخارجی دونوں طرح کا کرب انتہا کے درجے تک موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے مرثیوں میں غزل کی داخلی اور حزنیہ کیفیات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور قصیدے کا ظاہری شان وشوکت بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اُن کے مرثیوں میں جلوہ گر ہے۔قیصر بارہوی ایک بلند پایہ مرثیہ خواں بھی تھے۔انھوں نے مرثیہ پڑھنے کا ایک خاص انداز اپنایا ہوا تھا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''انھوں [قیصر بارہوی] نے اپنی مرثیہ خوانی کا منفرد انداز وضع کیا اور تحت اللفظ میں سوز خوانی کا پیوند لگا کر اہلِ محفل کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔۔۔بالفاظِ دیگر قیصر بارہوی کو مرثیہ گوئی کے اس فن کا موجد قرار دیا جاتا ہے تو اب وہ منتہی بھی شمار ہوتے ہیں کیوں کہ اِس طرزِ خاص میں اُن کی وفات کے بعد کسی مرثیہ گو نے مرثیہ نہیں پڑھا۔'' ۲۵

قیصر بارہوی نے کربلا کے تاریخی واقعے کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا اور اُن محسوسات کو مرثیے کے سانچے میں یوں مختلف النوع صورتوں میں پیش کیا جیسے ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا عمل کیا ہو۔مرثیے کی جانب راغب ہونے کے بعد ۱۹۴۹ء میں اُنھوں نے حضرت عباسؑ علمدار کے حوالے سے ۷۷ بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ قلم بند کیا جس میں لکھنؤ کی خاص فضا کا عکس بھی موجود ہے۔اُس مرثیے کو اہلِ علم ودانش اور صاحبانِ فن نے بہت زیادہ سراہا اور اُنھیں باقاعدہ طور پر اس صنف کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔مرثیے کے صنف کا لگایا ہوا یہ تخم ایک ایسا چھتنار درخت کی شکل میں اُبھرا کہ آج مرثیہ قیصر بارہوی کے لیے اور قیصر بارہوی مرثیے کے لیے شناخت بن چکے ہیں۔قیصر بارہوی نے اردو مرثیے کو کربلا کے واقعات کی خیرہ کر دینے والی روشنی میں ایک بلند اور عالی شان فتح کا نقارہ بنا دیا ہے۔

قیصر بارہوی ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان ہجرت کر کے آئے تو اُس وقت یہاں مرثیے کے لیے ماحول سازگار تھا،اس لیے وہ بھی باقاعدہ طور پر مرثیہ نگاری کی جانب راغب ہو گئے۔اُن کے مرثیوں کے بعض مجموعے ''عظیم مرثیے (مطبوعہ:لاہور حلقہ شعرائے اہلِ بیت ۱۹۷۷ء)''،''معراجِ بشر (مطبوعہ:لاہور امدادی اکیڈمی ۱۹۷۵ء)''،''شباب فطرت (مطبوعہ:سرگودھا مکتبہ تمکین ۱۹۶۹ء)''،''منفرد مرثیے (مطبوعہ:

لاہور حلقہ شعرائے اہل بیتؑ پاکستان ۱۹۹۰ء)''، ''منتخب مرثیے (مطبوعہ: لاہور قیصر بارہوی گولڈن جوبلی ۱۹۹۱ء)" اُن کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے جب کہ مزید دو مجموعے اُن کی وفات کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ جدید اردو مرثیے کے معتبر شاعر جناب قیصر بارہوی ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ء کو راہی ملکِ بقا ہوئے۔ اُن کی اس المناک موت سے اردو مرثیے کے صنف کا ایک روشن آفتاب غروب ہو گیا۔

مذکورہ بالا جدید مرثیہ نگاروں کا لگایا ہوا پودا ایک پھل دار شجر ثابت ہوا جس کی وجہ سے بہت سے ایسے مرثیہ نگار منظرِ عام پر آئے جنھوں نے اپنے افکارِ جمیل کے ذریعے اس صنف کو مالا مال کر کے بامِ ثریا تک پہنچا دیا۔ ان مرثیہ گو شعرا نے جدید مرثیے میں عصری شعور اور انسان کے سیاسی و سماجی مسائل کو پیش کیا۔ جدید مرثیہ اس لیے انفرادیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں کسی ایک منفرد موضوع کو زیرِ بحث لا کر واقعۂ کربلا سے اس کی کڑیاں ملائی جاتی ہیں جبکہ قدیم مرثیے کا ایک ہی موضوع ہوتا تھا یعنی واقعۂ کربلا، جس کے تحت قدیم مرثیہ گو اُسی ایک واقعے تک اپنے آپ کو محدود رکھتے تھے۔ آج ہر قابلِ قدر شاعر نے صنفِ مرثیہ میں طبع آزمائی ضرور کی ہے۔ عہدِ حاضر کے مرثیہ نگاروں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن خاص طور پر جن شعرا کے مرثیوں نے ادبی تاریخ پر اپنا کوئی نشان چھوڑا، اُن میں ڈاکٹر شبیہ الحسن،، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر ہلال نقوی، وحید الحسن ہاشمی، صبا اکبر آبادی، سہیل بنارسی، ڈاکٹر یاور عباس، ظفر شارب، اثر ترابی، حسن عسکری کاظمی، عبدالرؤف عروج، عزم جونپوری، وحید اختر، ناصر لکھنوی، مرزا محمد اشفاق شوق، طیب کاظمی، ساحر فاخری لکھنوی، رئیس امروہوی، راغب مراد آبادی، شوکت تھانوی، علامہ محسن اعظم گڑھی، قمر جلالوی، راجہ صاحب محمود آباد، کرار نوری، سیف زلفی، سید فیضی، فیض احمد فیض، اسیر فیض آبادی، اُمید فاضلی، مصطفےٰ زیدی، باقر امانت خانی، مہدی نظمی، شاہد نقوی، قیصر بارہوی، عظیم امروہوی، قسیم امروہوی، کوثر امروہوی، شیدا حسن زیدی، میر رضی میر عارف امام، ڈاکٹر خیال امروہوی، شہزاد معصومی، سردار نقوی، منظر عباس نقوی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، گوپی ناتھ امن، آغا سکندر مہدی، جعفر مہدی رزم، سہیل آفندی، شمیم نقوی، قسیم ابنِ قسیم، ڈاکٹر ماجد رضا عابدی، حسن عابدی، عرفی ہاشمی اور افسر عباس زیدی وغیرہ شامل ہیں۔

جدید دور سے تعلق رکھنے والے مرثیہ نگاروں نے اردو مرثیے کو ایک پہچان دی اور اُس کے موضوع اور مواد میں قابلِ قدر وسعت پیدا کی۔ اردو مرثیے کی جو روایت دکن اور دہلی سے ہوتی ہوئی لکھنؤ میں مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر اُستوار ہوئی تھی، اُسے آفاقیت سے ہم کنار کیا گیا۔ جدید عہد کے حوالے سے مرثیے میں فکر و نظر اور اسالیب کا جو تنوع نظر آتا ہے اس کا احاطہ یہاں مجموعی طور پر ناممکن ہے لیکن اگر کسی کو تفصیلاً جدید

مرثیے کے حوالے سے دل چسپی ہو تو اُنھیں ڈاکٹر ہلال نقوی کے ڈاکٹریٹ کے ضخیم تحقیقی مقالے ''بیسویں صدی اور اردو مرثیہ'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی خود بھی اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار ہیں۔ اُنھوں نے خود کو مرثیے کے فروغ اور اس کے حوالے سے تحقیق و تنقید کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ مرثیہ جدید دور میں بھی اپنا روایتی انداز اپناتے ہوئے اپنے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ اقدس اور شہادت سے متعلق اشعار تلمیحات اور تشبیہات، مستعمل اور پرانے ہر دونوں زمانوں کے نامساعد حالات کا حق ادا کرتی ہیں۔ چاہے مزاحمتی رویے ہوں یا سیاسی اُتار چڑھاؤ سے وابستہ شاعری ہو، آمریت کے خلاف صدائے احتجاج ہو یا ظالم و جابر بادشاہِ وقت کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا ہو، ہر قسم کے ظلم و جبر کے خلاف تخلیقی سطح پر شہادتِ حسینؑ سے وابستہ علامات و استعارات، تشبیہات و استعارات، درست اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

اگر ہم دورِ حاضر کے مرثیے پر غور کریں تو ہمیں حسینؑ، یزید، نیزہ، علم، خیمہ، دریائے فرات، پیاس، تشنگی، عطش، ریگستان، کربلا، دوپہر، دھوپ، گرمی، تپش، حدت اور شامِ غریباں اپنے لغوی معانی یا مرثیے کے مروج یا روایتی انداز و مفہوم سے بلند تر ہو کر عصری شعور کے ترجمان بھی ثابت رہے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں مرثیہ ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ بن چکا ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ''وجہی سے عبدالحق تک''، (طبع دوم)، خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۵۔
۲۔ ڈاکٹر ہلال نقوی: ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''، محمدی ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۷۔
۳۔ پروفیسر شارب ردولوی: ''مرثیہ اور مرثیہ نگار''، ص ۱۲۔
۴۔ علامہ اقبالؔ: ''کلیاتِ اقبالؔ'' (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۱۰۔
۵۔ مرزا اسداللہ خان غالب: ''دیوانِ غالب''، مکتبۂ جمال گنج شکر پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳۳۔
۶۔ پروفیسر شارب ردولوی: ''مرثیہ اور مرثیہ نگار''، ص: ۱۳۔
۷۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''سانحہ کربلا بطورِ شعری استعارہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۸۔
۸۔ پروفیسر شارب ردولوی (مرتب): ''اردو مرثیہ''، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۵۶۔
۹۔ پروفیسر شارب ردولوی (مرتب): ''اردو مرثیہ''، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۵۷۔
۱۰۔ سیّد ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی: ''اردو مرثیہ، میر انیسؔ کے بعد''، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۳۔
۱۱۔ عباس حسین کاظمی: ''نغمہ گرِ الہام شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی''، مشمولہ: سہ ماہی، پیغامِ، اسلام آباد شمارہ ۲۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۹۔

۱۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷۔
۱۳۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن: ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۲۔
۱۴۔ ڈاکٹر مسیح الزماں: ''اردو مرثیہ کے لافانی نقوش''، مشمولہ جدید فن مرثیہ نگاری، مرتبہ وحید الحسن، مکتبہ تعمیرِ ادب لاہور۔ س ن، ص ۳۶۔
۱۵۔ آلِ رضا: مرثیہ ''عظمتِ انسان''، مشمولہ: جدید فنِ مرثیہ نگاری، مرتبہ: وحید الحسن، ص ۹۹، ۱۷۶۔
۱۶۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن: ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار''، اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۲۔
۱۷۔ نسیم امروہوی: ''مراثی نسیم'' (جلد سوم)، اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۵۱۔
۱۸۔ عارف عبدالمتین (رائے): ''بجھی وہ شمع''، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸۔
۱۹۔ سید عاشور کاظمی: ''مرثیہ نظم کی اصناف میں''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۶۵۔
۲۰۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر (مرتبہ) جمیل مظہری کے مرثیے، احمد برادرز ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۔
۲۱۔ پروفیسر شارب ردولوی: ''مرثیہ اور مرثیہ نگار''، سمیع پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۱۳۔
۲۲۔ پروفیسر شارب ردولوی: ''مرثیہ اور مرثیہ نگار''، ص ۱۴۔
۲۳۔ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی: ''اردو مرثیہ، میر انیس کے بعد''، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۵۔
۲۴۔ مشفق خواجہ: ''شہادت''، (طبع دوم)، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۔
۲۵۔ ڈاکٹر انور سدید: ''جدید مرثیہ، قیصر بارہوی اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن''، مشمولہ: ماہ نامہ شام و سحر، لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۳۸۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

کتب:

۱۔ اقبال: ۱۹۷۵ء ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔
۲۔ اکبر آبادی، صبا: ۲۰۰۳ء، ''شہادت''، طبع دوم، بختیار اکیڈمی، کراچی۔
۳۔ امروہوی، نسیم: ۱۹۸۶ء، ''مراثی نسیم''، جلد سوم، اظہار سنز، لاہور۔
۴۔ ردولوی، شارب، ڈاکٹر (مرتب): ۲۰۰۱ء، ''اردو مرثیہ''، اردو اکادمی، دہلی۔
۵۔ شبیہ الحسن، سیّد، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء، ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار''، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور۔
۶۔ عارف عبدالمتین: ۱۹۸۷ء، ''بجھی وہ شمع''، اظہار سنز، لاہور۔
۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ۱۹۷۷ء، ''وجہی سے عبدالحق تک''، طبع دوم، خیابانِ ادب، لاہور۔
۸۔ غالب: ۲۰۰۶ء، ''دیوانِ غالب''، مکتبۂ جمال گنج شکر پرنٹرز لاہور۔
۹۔ کاظمی، طاہر حسین، سید، ڈاکٹر: ۱۹۹۷ء، ''اردو مرثیہ، میر انیس کے بعد''، نئی دہلی۔

۱۰۔ کاظمی، عاشور، سید: ۱۹۹۶ء، ''مرثیہ نظم کی اصناف میں''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔
۱۱۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، ۱۹۹۱ء، ص: ۳۷، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔
۱۲۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر: ۱۹۹۱ء، ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔
۱۳۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر: ۱۹۸۸ء، مرتبہ، ''جمیل مظہری کے مرثیے''، کراچی۔
۱۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر: ۱۹۹۴ء، ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''، محمدی ٹرسٹ، کراچی۔
۱۶۔ وحید الحسن: سن ندارد، مرتبہ ''جدید فن مرثیہ نگاری'' مکتبہ تعمیرِ ادب لاہور۔

رسائل:

۱۔ سہ ماہی، ''پیغامِ آشنا'' ۲۰۰۶ء، شمارہ ۲۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، اسلام آباد۔
۲۔ ماہ نامہ ''شام و سحر''، جولائی ۲۰۰۷ء، لاہور۔